دف و نے یا دیگر آلاتِ موسیقی سے روحانیت کو بیدار کرنا ایمان میں کوئی ثبات پیدا نہیں کرسکتا۔ جذبات آفرینی کے لیے یہ ایک عارضی وسیلہ ہے۔ لیکن اس وسیلے کو لازم کرلینا کہ اس کے بغیر عبادت میں کوئی لطف ہی نہ پیدا ہو، قلب کو اصلی مقصود سے ہٹا دیتا ہے۔ سماع صوتی ہو یا آلاتی اس کے جواز یا عدم جواز پر صوفی اور غیر صوفی مسلمانوں نے بہت بحثیں کی ہیں۔ بعض صوفیہ دف و نے کا استعمال کرتے تھے اور بعض اس سہارے کو ضروری نہ سمجھتے تھے بلکہ اس میں خطرہ محسوس کرتے تھے کہ موسیقی کی لذت عبادت کی لذت کی جگہ نہ لے لے۔ غالب کہتا ہے کہ اگر وجد آئے اور اس میں دست افشانی اور پاکوبی ہو تو یہ نفس کی اپنی کیفیت سے پیدا ہونی چاہیے۔ جس وجد کی آفرینش مصنوعی وسیلوں سے ہوتی ہے وہ ایک عصبی اور عضوی کیفیت ہے۔ بعض گراں پایہ صوفی ذوق روحانی کی فراوانی سے رقص کرنے لگتے تھے۔ مریدوں نے اس رقص ہی کو شعار بنا لیا اور دف و نے کی لے پر رقص کرنا اپنا طریقِ عمل قرار دے لیا۔ حالانکہ ان کے اندر وہ چیز نہ تھی جو پیر میں رقص آفرین ہوتی تھی ؎

منتخب رباعیات

راہیست ز عبد تا حضورِ اللہ
خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبیٰ کہ نشاں ہا دارد
سرچشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

عبد سے معبود تک ایک راستہ ہے۔ کسی کے لیے یہ راستہ دراز ہوتا ہے کسی کے لیے مقابلۃً چھوٹا۔ درازیٔ راہ دو طرح کی ہو سکتی ہے۔ ایک وہ جو گمراہی سے پیدا ہوتی ہے۔ گمراہ انسان بھٹکتا ہوا گلیوں کے پیچ و خم میں راستہ بھول بھول کر اگر منزل پر کبھی پہنچتا بھی ہے تو بڑی دیر میں۔ اسی لیے مومن کو یہ حکم اور ہدایت ہے کہ وہ سیدھے راستے پر چلنے کی دعا کرتا رہے۔ صراطِ مستقیم پر چلنے کے باوجود ایک دوسری قسم کی درازیٔ راہ ہے جس سے سالکان و عارفانِ خدا کو واسطہ پڑتا ہے وہ کسی منزل کو منزل نہیں سمجھتے اور خدا تک پہنچنے کے لیے ہر منزل کو نشانِ سرِ راہ تصور کرتے ہیں۔ ان کا تصور بہت دور ہوتا ہے۔ یہ دوری گمراہی نہیں بلکہ عرفان سے پیدا ہوتی ہے۔

آثارِ جنت پر رک جانے اور وہیں مطمئن ہو کر ڈیرے ڈال دینے والے ہمت کی کوتاہی کا ثبوت دیتے ہیں۔ راستے میں چشمہ اور سایہ پاکر تھوڑے عرصے تک دم لینا اور ستانا تو درست ہے لیکن اسے دلکش اور راحت آفریں پاکر وہیں رک جانا درست نہیں "بڑھے جا زندگی ذوقِ سفر ہے"
(اقبال)

ے در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم
کعبہ دیدم نقش پائے رہروان نامیدمش

ہر چند کہ زشت و ناسزائیم ہمہ
در عہدۂ رحمت خدائیم ہمہ
در بلوہ دہد چنانکہ مائیم ہمہ
شائستۂ نعمت و بوریائیم ہمہ

انسان کتنا بھی نیک بننے کی کوشش کرے۔ زشتی اور نالائقی خطا اور نسیان سے چھٹکارا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم بھی کہتا ہے کہ اگر ہر کردارِ زشت کی فوری سزا ملے اور عفو و رحمت پردہ پوشی و درگزر سے کام نہ لے تو روئے زمین پر کوئی مخلوق باقی نہ رہے۔ رحمت جو ساری ہستی کو احاطہ کیے ہوئے ہے وہی بقا کی ضامن ہے۔ فطرت انسان کی بے شمار غلط انگاریوں اور غلط کاریوں کی تلافی کرتی رہتی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ اگر ہماری سیرت بے نقاب کی جائے پھر ہمارا استحقاق دیکھا جائے تو سب کے سب اسی لائق ہوں کہ انھیں آتش انگیز مادے میں ڈالا جائے یا اجر میں کچھ ملے تو ایک بوریا ملے۔ چہ جائیکہ نعیم جنت بطورِ ثواب حاصل ہو۔ نفت و بوریا یک جا بھی نہیں ہو سکتے بوریے میں سے فوراً شعلے نکلیں گے۔ اور بوریا نشین اس میں سوخت ہو جائے گا شیکسپیئر بھی ایک جگہ کہتا ہے کہ اگر ہر شخص کو اعمال کی عادلانہ پاداش ملے تو ہر وقت درّے ہی پڑتے رہیں۔

چرگر کہ ز زخمہ زخم بر چنگ زند — پیداست کہ از بہر چہ آہنگ زند
در پردۂ ناخوشی خوشی پنہان است — گاز نہ زخشم جامہ بر سنگ زند

کوئی انسانی زندگی ایسی نہیں جو دُکھ سے خالی ہو۔ لیکن دُکھ کو خالی دُکھ سمجھ کر جن مذاہب اور فلسفوں نے نظریاتِ حیات قائم کیے وہ حقیقت سے دُور ہو گئے۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ خدا خیرِ مطلق اور رحمتِ کاملہ ہے لیکن اس کے باوجود زندگی میں جو شر نظر آتا ہے وہ اسی کے مقرر کردہ آئین کے مطابق پیدا ہوتا ہے۔ اگر زندگی کی صحیح معرفت حاصل ہو تو کیمیائے سعادت سے شر خیر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر شر کا عارضی وجود بھی نہ ہو تو اس کے ساتھ خیر کے امکانات بھی ختم ہو جائیں۔ دین کا کام یاس انگیزی نہیں بلکہ اقتدارِ حیات کے بقا کا یقین ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ مومن کے لیے نعمت اور مصیبت دونوں باعثِ برکت ہوتی ہیں۔ وہ نعمت سے لطف اٹھاتا اور شکر ادا کرتا ہے اور مصیبت پر صبر اور اس کا مقابلہ کر کے نفس میں تزکیہ اور تقویت پیدا کرتا ہے۔ غالب کہتا ہے کہ انسان کے سازِ حیات پر بھی تکلیف زخم زنی کرتی ہے وہ زخم نوازی کے لیے نہیں بلکہ نغمہ آخرینی کے لیے ہے۔ کمال درجے کی رجائیت اسی نظریۂ حیات سے پیدا ہوتی ہے۔ دوسری مثال اس رباعی میں یہ پیش کی گئی ہے کہ دھوبی جو ناصاف کپڑوں کو پتھر پر پٹکتا ہے تو وہ غصّے سے ایسا نہیں کرتا۔ وہ کپڑے کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا بلکہ آلودگی سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ اگر مصیبت کے متعلق یہی زاویۂ نگاہ اختیار کیا جائے تو پس پردہ ایک راحت دکھائی دے گی تلخ دوا سے شفا حاصل ہوتی ہے۔ مزاحمت پر غلبہ پانے سے قوت اور خود اعتمادی بڑھتی ہے۔ زندگی میں ایسی کیمیا موجود ہے کہ انسان ہر نقصان کو نفع میں تبدیل کر سکے۔ بقول عرفی ے

گوہر ہر سود در جیبِ زیاں انداختہ

مولانا روم نے مثنوی میں بھی یہی نظریۂ حیات پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ

قالین کو ڈنڈے مارنے والا قالین کا دشمن نہیں ہوتا۔ اس کی ضرب برقالین نہ زد برگرد زد ہے۔ خدا بھی کسی روح کو اذیت پہنچانا نہیں چاہتا۔ جھٹکنا اور پٹکنا سب بغرض اصلاح ہے۔ تعذیب کا مقصود تہذیب نفس ہے۔ مصائب کی عارضی ناخوشی گہری روحانی مسرت پیدا کر سکتی ہے۔ خدا چرگر یعنی زندگی کا ساز نواز ہے اس کی زخمہ زنی زخم زنی نہیں۔ اگر سازِ حیات درست ہو تو ہر ضرب نغمہ آفرین ہو سکتی ہے۔

کشتی از موج سوئے ساحل برود

رہرو از جادہ تا بمنزل برود!

خود شکوہ دلیل رفع آزار ایں است

آید بزبان ہر آنچہ از دل برود

پہلا شعر بہت صاف ہے اور مضمون میں کوئی خاص نکتہ نہیں۔ لیکن دوسرا شعر اعلیٰ درجے کی نفسیات پیش کرتا ہے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ شکوہ و شکایت اچھی چیز نہیں۔ غالب اس کے برعکس یہ تلقین کرتا ہے کہ اگر کچھ شکایت ہو۔ خاص کسی انسان سے ہو۔ یا زمانے کے حالات سے۔ تو اسے کھل کر بیان کر دینا ہی بہتر ہے جو شکایت دل ہی دل میں رہے وہ بہت مخرب حیات اثرات پیدا کرتی ہے جدید نفسیات نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ علاج نفسی کا سب سے اہم گر یہ ہے۔ نفس کا ہر اضطراب اور ہر پیچ و تاب زبان پر آنا چاہیے۔ بیان ہو جانے سے وہ دل سے نکل جاتا ہے۔ اس کی خلش باقی نہیں رہتی۔ شعور اور تحت الشعور میں صفائی اور توازن پیدا ہوتا ہے۔ بہت سی نفسی بیماریاں شکوے کو نفس کے تہ خانوں میں دفن کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ علاج نفسی میں مختلف طریقوں سے

اب یہی کوشش کی جاتی ہے کہ ان چھپی ہوئی اور تحت الشعور میں دبی ہوئی شکایتوں کو اظہار و بیان کا موقع ملے۔ غالب کہتا ہے جو چیز زبان پر آجاتی ہے وہ دل سے نکل جاتی ہے۔ جو شخص جرأت سے شکایت بیان کر دیتا ہے اس کا سینہ بے کینہ اور آئینہ ہو جاتا ہے کسی قسم کا تکدر باقی نہیں رہتا۔

اے آنکہ براہِ کعبہ روئے داری

نازم کہ گزیدہ آرزوئے داری

زیں گونہ کہ تندی خرامی دانم

در خانہ زنِ ستیزہ خوئے داری

اس رباعی میں بظاہر محض شوخی معلوم ہوتی ہے۔ کہ خانہ کعبہ کی طرف سفر کرنے والے کی تضحیک کی ہے۔ لیکن اس میں حقیقت کا بھی ایک پہلو ہے بعض لوگ ایک خاص قسم کی ظاہری دینی زندگی کی طرف محض اس لیے راجع ہوتے ہیں کہ وہ زن و فرزند کی پرورش کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو کر اپنے لیے فراغت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ترکِ دنیا کی محرک اسی قسم کی گریز ہوتی ہے۔ مگر اس رباعی میں ان حضرات کی طرف اشارہ نہیں بلکہ کسی ایسے قابل رحم شوہر کی حالت بیان کی گئی ہے جو کسی تند مزاج لڑاکا بیوی سے بھاگنا چاہتا ہے لیکن کوئی ایسا بہانہ ہاتھ نہیں آتا جسے لوگ مذموم سمجھنے کے بجائے سراہیں۔ نہ بیوی معترض ہو سکے نہ خویش و اقارب۔ غالب کہتا ہے تیری یہ تیز خرامی اس کی غماز ہے کہ تو نے ستیزہ خو اور جنگجو بیوی سے راہِ فرار اختیار کی ہے۔ ایسا شخص کچھ عرصہ چھٹکارا پانے میں ہمدردی کا مستحق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن غالب یہ کہنا چاہتا ہے کہ نفس کے دھوکے بھی بہت گہرے ہوتے ہیں اور اس کا

امکان ہے کہ ایسا شخص خود اپنے اصلی محرک سے شعوری طور پر نا آشنا ہو اور واقعی یہ سمجھ رہا ہو کہ میں حج کا فریضہ ادا کرنے کی وجہ سے مستعدی اور مسرّت محسوس کر رہا ہوں۔ ہندوؤں میں بسا اوقات ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ ایک شخص یک بیک زن و فرزند کو چھوڑ کر تارک الدّنیا سادھو بن جاتا ہے۔ جن مذاہب میں رہبانیت مستحسن شمار ہوتی ہے ان کے پیرو اس پر اعتراض نہیں کر سکتے۔

راقم الحروف کو ایک گریجویٹ ہندو سادھو سے ملاقات کا موقع ملا۔ جو بیوی بچوں کو چھوڑ کر شہر بہ شہر اور کوہ بہ کوہ جہاں جی چاہے رہتا اور پھرتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ تو فرض ناشناسی معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر سب لوگ مجرّد ہو جائیں متاہل زندگی سے بھاگ نکلیں تو نسل انسانی ہی ختم ہو جائے۔ اس نے ایسا جواب دیا جس نے مجھے ساکت کر دیا۔ فرمایا کہ یہی تو مقصود ہے زندگی دُکھ ہی دکھ ہے اس کا خاتمہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ ایک سادھو کا قصّہ ہے کہ اہل و عیال کو چھوڑ کر سادھو اور جوگی بن گیا۔ اپنے گھر اور اپنے شہر سے غائب ہو گیا۔ جوگیا کپڑے پہن لیے۔ لٹیں بڑھا لیں۔ برسوں کے بعد وہ بھکاری کے بھیس میں پھرتا پھراتا اپنے شہر میں بھی بھیک مانگتا ہوا آ نکلا۔ اس عرصے میں بیوی محنت مزدوری سے اور مانگ کر گزارہ کرتی رہی۔ اس نے اپنی گلی میں بھی پُن دان کے لیے صدا لگائی۔ مفلس بیوی اب بھی اپنے دو مٹھی آٹے میں سے بھکاری کو کچھ دینے پر آمادہ ہوئی۔ غور سے دیکھا تو سادھو اس کا گُم شدہ اور تارک الدّنیا شوہر نکلا۔ کہنے لگی کہ خیر پہلا رشتہ تو نہ رہا۔ لیکن پرانے تعلق کا پھر بھی کچھ پاس ہے۔ خالی آٹا کیا دوں۔ ذرا بیٹھو تو تمھیں دو روٹیاں پکا دوں۔ سادھو نے اپنا بھاری بقچہ رکھ دیا اور اس میں سے گھی کا ایک چھوٹا ٹین نکالا کہ روٹیوں پر چپڑ دو۔ اس کے بعد لپٹن کی چائے کا ایک ڈبّا

اور شکر کی ایک ڈبیا نکالی کہ ذرا چائے بھی بنا دو۔ اس پر دھرم پتنی کو بہت طیش آیا۔ اور اس نے زور سے اسے ایک دو تھپڑ مار کر کہا بھگوڑا کہتا تھا کہ میں دُنیا چھوڑ رہا ہوں۔ ساری دُنیا تو اپنے تھیلے میں بھر رکھّی ہے شاید دُنیا کے معنی میں ہی تھی۔ جسے تو چھوڑ کر بھاگنا چاہتا تھا۔

غالب کہتا ہے کہ دین کے ظواہر اور شعائر کی طرف رُخ کرنے والوں کے محرکات ہمیشہ خالص دینی نہیں ہوتے۔ فرائض سے گریز بھی انسان کو بعض اوقات اس طرف لاتی ہے اور کبھی گھر بار کی مصیبتوں سے تنگ آ کر لوگ خانقاہوں کی طرف رُخ کرتے اور نفس کو دھوکا دیتے ہیں۔ کہ وہ دُنیا سے دین کی طرف آ گئے ہیں۔

آں راکہ بود درستیٔ در فرجام
ہم محرم خاص آمد و ہم مرجع عام
آساں نبود کشاکشِ پاسِ قبول
زنہار نہ گردی بہ نکوئی بدنام

ہر صاحب کمال کو یہ مصیبت پیش آتی ہے۔ کہ خاص و عام اس کی طرف رجوع کرنے لگتے ہیں۔ کوئی سلام کرنے کے لیے کوئی مراد طلبی کے لیے۔ کوئی لُطفِ صحبت کے لیے۔ کوئی سفارش کے لیے۔ عالم ہو یا ولی یا ماہر ہنر اس کے لیے فرصت کا کوئی لمحہ نہیں چھوڑتے۔ اس کثرتِ جلوت میں اسے خلوت کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ جس میں وہ کچھ غور و فکر کر سکے۔ فکر و ذکر دونوں کے لیے فرصت اور خلوت درکار ہے۔ یہ رباعی اس مضمون کے مطابق ہے جو مولانا روم کہ گئے ہیں کہ ؎

اشتہارِ خلق بندِ محکم است

در بلا از بندِ آہن کے کم است

کسی روحانی یا علمی کمال میں مشہور ہو جانا انسان کو آہنیں بیڑیاں پہنا دیتا ہے ۔ اس کی آزادی سلب ہو جاتی ہے ۔ وہ ہر کس و ناکس کی توجہ کا ہدف بن جاتا ہے مقبولیت ایسی کشاکش پیدا کرتی ہے کہ خدا کی پناہ ۔ بدنامی سے بھی شاید اتنا ضرر نہ پہنچتا ہو جتنا نیک نامی سے پہنچتا ہے ۔ غالب اپنے لطیف انداز میں کہتا ہے خدا نہ کرے کہ کوئی شخص خوبی میں بدنام ہو جائے ۔ یعنی شہرت سے ضرر پانے لگے

در عالمِ بے زری کہ تلخ است حیات

طاعت نتواں کرد با امیدِ نجات

اے کاش زحق اشارتِ صوم و صلوات

بودے بوجودِ مال چوں حج و زکوٰۃ !

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جانگداز مفلسی میں دینی فرائض کا ادا کرنا بھی دشوار اور بعض اوقات محال ہو جاتا ہے ۔ سعدی علیہ الرحمۃ بھی فرما گئے ہیں کہ مفلس جب نماز کی نیت باندھتا ہے تو دل خدا کی طرف رجوع ہونے کے بجائے یہ سوچنے لگتا ہے کہ کل بال بچوں کے لیے روٹی کہاں سے آئے گی ۔

؎ شب چو عقدِ نماز بر بندم

چہ خورد بامداد فرزندم

حدیث شریف میں ہے کہ مفلسی انسان کو کفر کے بہت قریب لے آتی ہے ۔ نماز کے لیے کپڑے اور جسم پاک صاف رکھنا ایک لازم شرط ہے مفلس جس کے پاس کپڑوں کا ایک ہی پھٹا پرانا جوڑا ہوتا ہے غلیظ مزدوری کرتے

ہوئے بھی وہی پہنتا ہے ۔ دن میں بھی وہی پہنتا ہے ۔ رات میں بھی وہ اس کا جسمِ خواب ہوتا ہے ۔ ایسی حالت میں طہارت کا قائم رکھنا امرِ محال بن جاتا ہے ۔ یہی حال روزے کا ہے جنھیں کوئی کٹھن کام کرنا نہیں پڑتا وہ آسانی سے روزہ رکھ سکتے ہیں ۔ لیکن اگر گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں یا بھٹیوں کے سامنے اور کارخانوں میں آٹھ دس گھنٹے مزدوری کرنی پڑے تو روزہ دار کو بعض اوقات جان کے لالے پڑ جاتے ہیں ۔ اسی لیے جہاد میں روزہ معاف ہے ۔ غالب ظریفانہ انداز میں کہتا ہے کہ حج و زکوٰۃ صرف مال والوں پر فرض ہیں مفلس کے لیے محض امیدِ نجات پر عبادات کے لوازم کو کماحقہٗ پورا کرنا محال ہے ۔ غالب کے اندازِ بیان میں شوخی ہے ۔ لیکن حقیقت سے خالی نہیں ۔

ہر چند زمانہ مجمع جہال است !

در جہل نہ حالِ شان یک مثال است

کو دون ہمہ ایک از یکے تا دگرے

فرقِ خرِ عیسیٰؑ و دجال است

اس رباعی کا حوالہ پہلے بھی ایک شرح کے مضمون میں آ چکا ہے ۔ کہتا ہے کہ دنیا زیادہ تر جاہلوں سے بھری پڑی ہے ۔ لیکن جاہلوں کی کئی قسمیں ہیں کوئی جہل بسیط میں مبتلا ہے ۔ کوئی جہل مرکب میں ۔ کسی کا جہل اپنے اور دوسروں کے لیے ضرر رساں ہے اور کسی کا جہل مقابلتاً معصومانہ جہل ہے ۔ کسی کی جہالت ظلم اور عیاری میں سرزد ہوتی ہے ۔ غالب معصوم جاہل کو خرِ عیسیٰؑ کہتا ہے ۔ جو جاہل ہونے کے باوجود ایک روحانی پیشوا کا معاون اور خدمت گزار تو ہے ۔ لیکن ظلوماً جہولا کو وہ خرِ دجال کہتا ہے ۔ ہے وہ بھی گدھا لیکن دجل و مکر و فریب میں معاون ہے

اور جہالت کی وجہ سے دوسروں کو عظیم نقصان پہنچتا ہے۔

گر گردنہ گنج گہرے برخیزد
مپسند کہ دود از جگرے برخیزد
منت نتواں نہاد بر گدیہ گراں
بنشیں کہ بخدمت دگرے برخیزد

گنج گہر لٹ کر یا بذل و نوال میں ختم ہو کر فنا ہو جائے تو اس سے بہتر ہے کہ محتاجوں کی حاجت روائی سے منہ پھیر کر ان کے قلب و جگر سے آہ نکالی جائے۔ سوال کرنے والے کو کچھ عطا کر کے اس پر احسان جتانا نہایت بیہودہ حرکت ہے۔ اس کے سوال کو رد کر دینا اس دل آزاری سے بہتر ہے۔ چوتھے مصرع کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر احسان جتانا ہے تو اس سے بہتر ہے کہ تو کچھ نہ کر اور اپنی جگہ بیٹھا رہ کوئی دوسرا شخص اس خدمت کے لیے تیار ہو جائے گا۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ کسی سے نیکی کر کے تو خاموش رہ۔ جس پر تو نے احسان کیا ہے وہ خود احسان شناسی کے جذبے سے تیری خدمت کے لیے کھڑا ہو جائے گا۔

گر در طلب دوست بود پائے تو سست　　غمگیں مشو!
ور خود باشی بہ جستجو تو چابک و چست　　مغرور مشو!
اخلاص بہ نسبت است و نسبت ازلیست　　چوں شبنم و مہر
گر جذبہ قوی فتاد و پیوند درست　　بیخود مے رو

مقصودِ حیات یا خدا کی طلب میں اگر تو تیز گام نہیں اور اپنی محدود قوتوں اور موانعِ حیات کی وجہ سے تیری رفتار سست ہے تو غمگین ہو کر سر بزانو ہونے کی

ضرورت نہیں۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَھَا خدا کسی کو اس کی طاقت اور وسعت سے زیادہ مکلف نہیں بناتا۔ اصل بات یہ ہے کہ طلب مقصود مفقود نہ ہونی چاہیے اور قدم آہستہ ہی سہی لیکن آگے کی طرف بڑھنا چاہیے۔ ہمت کی کمی پر افسوس کرنے سے اس میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یاس قوتوں کو زائل کر دیتی ہے دوسری طرف بعض گرم رو طالبانِ حق ہیں جو سرعت سے منزلیں طے کر رہے ہیں انھیں ایک اور آفت سے بچنا چاہیے۔ ان میں حلم کے بجائے غرور پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ تیزی سے کمالات حاصل کرنے والے لوگ اگر اپنے نفس کے نگہبان نہ رہیں تو ان میں پندار و استکبار پیدا ہوتا ہے۔ طلب میں سستی یا چستی توفیقِ الٰہی سے ہے اصل چیز اخلاص ہے۔ خدا اور روحِ انسانی کی باہمی نسبت ازلی ہے۔ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوا بَلٰی کے سوال اور اقرار سے یہ نسبت قائم ہوئی یہ نسبت شبنم اور خورشید کے رابطے کے انداز کی ہے۔ قطرۂ شبنم کو لازماً سورج اپنی طرف اٹھائے گا۔ جذبہ قوی اور رابطہ درست ہو تو خود بخود انسان خدا کی طرف کھچا چلا جائے گا۔ اس نسبت سے اخلاص موجود ہے اور طلب صادق ہے تو دیر زود سستی یا چستی سے انسان مقصود کو پا لے گا۔

ہر چند تواں بے سر و ساماں بودن
باز بچۂ خوئے زشت نتواں بودن
باللہ کہ زدشنہ بر جگر سخت تر است
از کردۂ خویشتن پشیماں بودن!

ہر اچھے شاعر کی طرح غالب غیر معمولی حساس طبیعت کا مالک تھا۔ اچھی شاعری شدتِ احساس ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

ے خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

یہ احساس انبیاء و اولیاء و صلحاء میں بہت شدید ہوتا ہے۔ اچھی شاعری میں ایک جزوِ پیغمبری ہے۔ لہٰذا اس صفت سے اچھے شعرا کو بھی حصہ ملتا ہے۔ غالب پر اس کی زندگی کے آخری دور میں خصوصاً غدر کے بعد بہت بے سروسامانی طاری رہی۔ لیکن خوش خلقی میں فرق نہ آیا۔ کمال ناداری میں بھی کسی پرانے ملازم کو برطرف نہ کیا۔ انقلابِ روزگار سے ایک دوست جس پر خوش حالی کے بعد عسرت طاری ہو گئی تھی سستے کپڑے کا فرغل پہنے ہوئے اس کے پاس آیا۔ غالب کے پاس اچھے دنوں کا ایک قیمتی چغہ باقی تھا۔ دوست کی خودداری کو ٹھیس نہ لگانے کی یہ ترکیب نکالی کہ اس کے سستے فرغل کی تعریف شروع کر دی اور کہا کہ بھائی ہمارے چغے سے بدل لو۔ ہمیں یہ بہت پسند ہے۔ غالب رند و آزاد مشرب تھا عابد نہ تھا۔ شراب پیتا تھا۔ لیکن کبھی اس نے زشت خوئی کا ثبوت نہ دیا۔ زشت خوئی سے وہ فطرتاً محفوظ تھا۔ اور وہ بھی حساس اور خوددار ہونے کی وجہ سے بہت محتاط رہتا تھا کہ کسی کی خودداری کو ٹھیس نہ لگے۔ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

ے خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم،
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

بعض لوگ جیسے امیری کے بعد افلاس میں گرتے ہیں تو دولت کے ساتھ اخلاق بھی کھو بیٹھتے ہیں کہتا ہے کہ بے سروسامانی میں بھی بازیچۂ خوئے زشت نہ ہونا چاہیے۔ کسی کی دل آزاری اور ضرر رسانی کے بعد حساس ضمیر والے شخص کو جو پشیمانی ہوتی ہے اس کی تکلیف جگر پر خنجر پڑنے سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ رباعی غالب

کی اپنی سیرت کا ایک سچا بیان ہے۔

اقبال بھی اپنی قسم کے تلمیذ الرحمٰن شاعر کو دیدۂ بینائے قوم کہتا ہے۔ آنکھ کا وظیفہ بینائی بھی ہے اور درد سے اشک ریزی بھی۔

ے بتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

دارم دل شاد و دیدۂ بینائے
وز کری گوشم نبود پروائے
خوب است کہ نشنوم زہر خود رائے
گلبانگِ انا ربکم الا علائے

غالب پر طرح طرح کی آفتیں آئیں۔ اس نے ہر طرح کے غم دیکھے۔ غم عشق بھی اور غمِ روزگار بھی۔ حوادثِ دہر میں سے شاید ہی کوئی ایسا حادثہ ہو جس کی ضرب اس نے محسوس نہ کی ہو۔ لیکن کچھ حکمت کی بدولت اور کچھ غیر معمولی طبعی ظرافت کی وجہ سے کوئی حادثہ غالب کو مغلوب نہ کر سکا۔ جو کچھ وارد ہوا اسے ہنس کر ٹال دیا۔ ہر شر میں خیر کے پہلو پر نظر رکھی۔ عمر کے آخری حصے میں اس کا بہروپن بہت بڑھ گیا تھا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ مخاطب اپنی بات لکھ کر اس کے سامنے رکھتا تھا خطوں میں اپنی کسی مصیبت کا بیان کرتا ہے تو اکثر ظریفانہ انداز میں کرتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مصیبت سے مغلوب نہیں ہوا۔ بہروپن کے متعلق اردو میں کہتا ہے ے

بہروپوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

اب فارسی کی اس رباعی میں نقصِ سماعت کا ایک بڑا فائدہ بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے۔ . . . . اصل ضرورت اس کی ہے کہ دل و دیدہ درست ہوں سو بفضلہٖ اُن میں کوئی نقص نہیں آیا۔ شنوائی ایسی ضروری نہیں جیسی بینائی۔ جب کان کھلے تھے تو بڑی مصیبت یہ تھی کہ ہر شخص میرے سامنے کبر و غرور و پندار سے ڈینگیں مارتا اور مجھے سُننی پڑتی تھیں۔ زیادہ تر لوگوں کی گفتگو کچھ اس ہی ہوتی ہے اور مردِ حکم کے لیے سمع خراش لیکن مروّت کی وجہ سے سُننی پڑتی ہے۔ خدا کا شکر کرتا ہے کہ اس سے نجات ہوئی۔ مشہور مغربی موسیقار بیٹ ہوون نے اعلیٰ درجے کی رُوح کو مرتعش کرنے کی موسیقی اس وقت پیدا کی جب غالب کی طرح اس کے کان بھی دیوارِ بے در بن گئے تھے نغمہ جس کا تعلّق شنوائی سے ہے اس کی آفرینش کے لیے بھی کرّی گوش مزاحم نہیں۔ گراموفون کا موجد جس نے انسانی آوازوں کو الواح میں محفوظ کر کے حیاتِ جاودانی بخشی وہ بھی عالمِ شباب ہی میں بہرا ہو گیا تھا۔ فطرت اس سے یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ انسان فقط حواسِ خمسہ اور اعصائے ظاہری ہی کا مرکّب نہیں۔ اصل چیز دل اور اس کی بصیرت ہے جو ان آلات کے بغیر بھی کام کرتی ہے۔ ہر شر کو خیر میں بدلنا اور ہر نقصان میں نفع کا پہلو نکالنا اسی کو کیمیائے سعادت کہتے ہیں۔

آنرا کہ زدستِ بے زری پامال است
رسوائی نیز لازمِ احوال است
نانِ خشک لیم و خرقہ آلودہ بہ مے
ساقی مگرش پیالہ از غربال است

یہ رباعی کسی پہلی شرح کے تحت میں درج ہو چکی ہے۔ غریب کے چھوٹے گناہوں کو بھی دُنیا بانس پر چڑھا دیتی ہے۔ لذّت گناہ کم اور ندامت و شماتتِ ہمسایہ

زیادہ۔ لبِ خشک اور دامن تر۔ امیروں کے عیوب کے لیے لوگ اچھی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ دولت ان کے لیے ستّارِ عیوب ہو جاتی ہے۔